سعادت حسن منٹو، بٹوت، بیگو اور ایک نایاب خط

ڈاکٹر لیاقت جعفری
گورنمنٹ کالج فار وومن، گاندھی نگر جموں
رابطہ 09419184052

[یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ منٹو کشمیری النسل تھا لیکن ایسی دستاویزات بہت کم ہیں جن سے یہ ثابت ہو کہ وہ کبھی کشمیر آئے تھے یا انہوں نے کشمیر کا رُخ کیا تھا۔ سوائے اس واقعے کے کہ دِق کے مرض کے دوران انہیں بغرضِ علاج بٹوت (موجودہ ضلع رام بن) تک آنا پڑا تھا۔ منٹو اور بٹوت کے اسی تعلق کو کھنگالتے ہوئے اس مضمون میں راقم نے منٹو کے مشہور افسانہ ''بیگو'' کو بنیاد بنا کر یہ تحقیقی مضمون قلم بند کیا ہے۔ اس مضمون کے ذریعے منٹو کا وہ تاریخی خط بھی آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے جو انہوں نے بٹوت سے امرتسر اپنی والدہ کو لکھا تھا۔ یہ مضمون اس حوالے سے بھی بہت دل چسپ ہے کہ اس موضوع پر بہت کم لکھا اور پڑھا گیا ہے۔]

میں منٹو اور بٹوت کے اس رشتے کی تحقیق کے سلسلے میں گزرے سال کے آخری مہینے میں بٹوٹ پہنچا، اُس وقت بٹوت میں دفتر جما کر بیٹھے ریاست کے نامور پولیس افسر بسنت رتھ علاقہ رام بن، ڈوڈہ، کشتوار کے ڈی آئی جی تھے، بسنت خود بھی انگریزی کے ایک سنجیدہ شاعر اور ناول نویس ہیں۔ منٹو کے بے پناہ فین اور میرے قریبی دوست۔

اسی رینج کے ایس ایس پی مشتاق احمد چودھری بھی منٹو کے مریدوں میں سے ایک ہیں، انہوں نے بھی منٹو کو خوب پڑھ رکھا ہے، انہوں نے میرے کام کی آسانی میں کلیدی رول ادا کیا۔

منٹو کی کہانی "بیگو" کے مرکزی کردار بیگو کے بقیہ اسلاف اور خانوادے کی تلاش میں دسمبر ۲۰۱۷ء کے پہلے ہفتے میں بسنت رتھ کا مہمان بن کر میں ایک شام بٹوت پہنچا، میں نے قریب تین روز بٹوت قیام کیا۔

اس دوران مشتاق صاحب نے میری ملاقات ایک ایسے شخص سے کرائی جو بیگو کا انتہائی قریبی رشتہ دار ہے اور بیگو کے بارے میں خوب جانتا ہے، سعد اللہ شاہ میر کی عمر اِس وقت تقریباً پینسٹھ سال ہے، اور وہ بیگو کے چھوٹے بھائی مرحوم غلام حسین میر کے بیٹے ہیں، گویا بیگو کے بھانجے۔ بزرگوں میں سے یہی ایک شخص ہے جو منٹو پر بات کرنے کے حوالے سے سنجیدہ نظر آئے۔ ان کے علاوہ اس پورے قصبے میں ایک بھی شخص ایسا نہیں ملا جو منٹو کا نام بھی جانتا ہے، منٹو کو جاننے پہچاننے والے ایک ایک کر کے دار فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔ سعد اللہ شاہ کو اس کہانی کی ایک آخری کڑی سمجھ لیجیے، شاہ صاحب بہت فعال سماجی کارکن ہیں اور انکا پیشہ ٹھیکے داری ہے۔

سعد اللہ شاہ میر صاحب کے مطابق بیگو ابھی قریب چودہ پندرہ سال پہلے تک حیات تھیں، ان کا اصل نام اقبال بیگم تھا اور سعد اللہ شاہ میر کے دادا جان کمال میر کی بیٹی تھیں، بقول سعد اللہ شاہ بیگو ساڑھے چھ فٹ کی طویل قامت بلا کی خوبصورت اور تیکھے نین

نقش والی خاتون تھیں، کچھ سال پہلے وفات کے وقت ان کی عمر پچاسی نوے کے بیچ میں رہی ہوگی، شادی کے باوجود ان کے ہاں کوئی اولاد نا ہوئی البتہ انھوں نے ایک بچہ گود لیا ہوا تھا۔

بیگو ایک کشمیری النسل خاتون تھیں، میر خانوادے سے تعلق رکھتی تھیں، کشمیری کے نامور شاعر رسول احمد میر کے گاؤں ڈورو شاہ آباد کشمیر سے ان کا شجرہ ملتا ہے۔ رام بن اور ڈوڈہ بیلٹ میں آ بسے کشمیری میر خانوادے کے لوگ بٹوت کے علاوہ نواحی دیہاتوں بھلیسہ اور گوہامرمت تک پھیلے ہوئے ہیں، یہ میر خاندان تقریباً اڑھائی سو سال پہلے ان علاقوں میں آ بسے ہیں۔

سعد اللہ شاہ کے مطابق ان کے خاندان میں منٹو کو لے کر کوئی زیادہ بات چیت نہیں ہوتی تھی، والد صاحب کبھی کبھار ضمناً ذکر کرتے تھے۔ البتہ میں نے جب ہوش سنبھالا تو پڑھائی لکھائی کے دوران منٹو کا نام سنا، گریجویشن کرنے تک منٹو کی ایک دو چیزیں بھی پڑھیں، خاص طور پہ ان کا افسانہ ''کالی شلوار'' مجھے بہت پسند ہے۔ انہی دنوں میری پھوپھی مرحومہ اقبال بیگم کو مرکز بنا کر ان کا لکھا افسانہ" بیگو" بھی پڑھا تو جانا کہ یہ میری پھوپھی کا ہی افسانوی قصّہ ہے۔

سعد اللہ شاہ کے مطابق افسانہ ایک ایسی صنف ہے جس میں تخلیق کار کا تخیلاتی ذہن زیادہ رول ادا کرتا ہے، ضروری نہیں ہے وہ سب حقیقت ہی ہو، فکشن ایسے ہی لکھا جاتا ہے، ٹھیک ہے منٹو نے بیگو کو دیکھا ہوگا اسے چاہا ہوگا اس سے ملاقاتیں کی ہوں گی، بعد ازاں بٹوت سے جانے کے بعد ایک کہانی بھی لکھ ماری، لیکن فکشن کی تخلیق کے اپنے لوازمات ہوتے ہیں سو منٹو نے حقیقت اور افسانے کی آمیزش سے یہ قصّہ گڑھا ہے۔

سعد اللہ شاہ کے مطابق ٹی بی کی لاعلاج بیماری کے دوران منٹو لاہور اور امرتسر سے مختلف سالوں میں قریب چار پانچ مرتبہ بٹوت آئے ہیں، ٹی بی کے مرض کا ان دنوں کوئی علاج نہ تھا آخرش مریض فوت ہی ہو جاتا تھا۔ سو اس مرض کے مریض کو گرمی کے دنوں میں بٹوت کی طرف آنا ہی پڑتا تھا۔ شمالی ہندوستان میں اتنے بڑے پیمانے پر مریضوں کو سنبھالنے والا یہی ایک سینا ٹوریم تھا۔ زیادہ تر قریبی شہروں سیالکوٹ امرتسر پنجاب وزیر آباد سے ہی لوگ اس طرف آتے تھے۔ دِق کے مریضوں کے اس علاج مرکز کے علاوہ بھی یہ علاقہ سیاحت کا ایک مشہور مقام تھا۔ دیودار اور کیل کے درخت یہاں کے موسم کو قدرتی طور پر بہت ٹھنڈا اور موافق بنا کے رکھتے تھے۔ لوگ گرمیوں سے نجات پانے کے لئے اس طرف آتے تھے اور قریباً دو تین مہینے تک یہاں گزارتے تھے، البتہ سینا ٹالیس سے قبل اس طرف آنے والے پردیسیوں کی بڑی وجہ یہ سنا ٹوریم ہی تھا۔

سعد اللہ شاہ کے مطابق ۶۸ ۔ ۱۹۶۷ء میں یہ سینا ٹوریم ختم کر دیا گیا، اور اس کو شفٹ کر کے اودھم پور بھیج دیا گیا، فی الحال اس سینا ٹوریم کی پرانی عمارت کے کچھ کمرے باقی ہیں، جس میں اس وقت پرائم ری ہیلتھ سنٹر کام کر رہا ہے، کچھ ایک کمرے اسپتال کے چھوٹے ملازمین کے کوارٹر اور رہایش کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس اسپتال کے اوپری حصّے کے بڑے بڑے وینٹی لیشن اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ بلڈنگ باضابطہ اس وبائی مرض کے پھیلاؤ کو روکنے کے لئے ڈیزائن کی گئی تھی۔ دیکھنے میں یہ عجیب وغریب سی عمارت لگتی ہے۔ یہ قصباتی آبادی سے دور جنگل میں تعمیر کی ہوئی بلڈنگ ہے۔ سینا ٹوریم کی تحویل میں کل ۲۹۸ کنال رقبہ ہے،

آج کی تاریخ میں بٹوت قصبہ کا جنرل اسپتال یہی ہے۔ پرانا اسپتال اور ٹی بی کی عمارت ابھی موجود ہے جب کہ باقی حصّہ کھنڈرات میں بدل چکا ہے۔ اسی حصّے میں تعمیر کردہ کچھ مزید نئے وارڈ بھی اب اسپتال کا حصّہ ہیں۔

سعد اللہ شاہ کے مطابق بٹوت اور منٹو کے تعلق کے حوالے سے کوئی بھی ڈاکومنٹ تحریر میں ملنا مشکل ہے، نا کوئی فلم ٹی وی یا ڈاکومنٹری کی ٹیم ہی اس طرف آئی ہے، آپ شاید پہلے شخص ہیں جو بیگو کے خاندان کی جڑوں کی تلاش میں اس طرف وارد ہوئے ہیں۔

سعد اللہ شاہ نے یہ بھی بتایا کہ مرحومین منٹو یا منٹو کی تحریروں کو پڑھنے سے باز رکھتے تھے کہ وہ ایک فحش نگار ہے، بچوں کے ذہن خراب کرتا ہے۔ مجھے بہت بعد میں جا کر منٹو اور بٹوت کے تعلق کا علم ہوا تو میں نے اسے قریب سے پڑھا، تبھی یہ علم بھی ہوا کہ ''بیگو'' نام کا افسانہ میری پھوپھی اقبال بیگم کو مرکزی کردار بنا کر لکھا گیا ہے۔

سعد اللہ شاہ نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا کہ حکومت کو بٹوت قصبے کے اس تاریخی پہلو کے مدنظر یہاں منٹو کے نام پر کسی کالج اسپتال روڈ چوراہے کا نام ضرور رکھنا چاہئے تا کہ آئندہ نسلیں بھی اس مقام کی تاریخی حیثیت کی قدر کریں۔ انھوں نے افسوس کا اظہار کیا کہ نئی نسل سرے سے منٹو یا اس نام کے کسی شخص کے بارے میں کچھ جانتی ہے۔ یہ تو ایک نامور اور ادب نواز پولیس افسر کی دلچسپی کی بدولت آپ نے اس موضوع پر تحقیق کی، ورنہ آج کی مصروف زندگی میں کس کے پاس ان موضوعات پر بات کرنے کا وقت ہے۔ ابھی سرینگر اور جموں کے درمیان قائم ہوئے ناشری ٹنل کی وجہ سے اس خطہ کی اہمیت بڑھی ہے، ورنہ یہ تو محض ایک گزرگاہ تھی جہاں راہگیروں کے ٹرک آ کر راتوں کو رکتے رہے ہیں۔ گورنمنٹ کو چاہئے کہ وہ اس قصبے کی اس تاریخی اہمیت کے مدنظر منٹو کے نام پر کچھ ایسا کام کرے جس کی وجہ سے منٹو کا نام بھی بٹوت کے ساتھ منسوب رہے اور خطہ کی عوام کی کچھ بہتری بھی ہو، ورنہ گزرتے وقت کے ساتھ سب کچھ مٹتا چلا جا رہا ہے۔

بہر حال یہ باتیں پھر کبھی۔ پہلے تفصیل اس افسانے کی جس کا پلاٹ بٹوت ہے اور جس کا مرکزی کردار بیگو ہے۔

بیگو میں جس منٹو کو ہم کہانی کے آغاز میں دیکھتے ہیں وہ دِق کے مرض میں مبتلا ایک ایسا مریض ہے جو زندگی کی آخری سانسیں گن رہا ہے۔ یہ بٹوت میں اپنی زندگی کے سینتیسویں سال میں آئے اس کشمیری النسل نامور نوجوان فکشن نگار ادیب کا قصّہ ہے جو ایک ایسے موذی مرض کا شکار ہے جس کا مناسب علاج ابھی دنیا نے تلاش نہیں کیا ہے۔

منٹو کی ولادت ۱۱ رمئی ۱۹۱۲ء کو غیر منقسم ہندوستان کے صوبہ پنجاب کے ڈسٹرکٹ لدھیانہ کے گاؤں سمرالہ میں ہوئی ہے، اس حساب سے اگر منٹو کی اس کہانی بیگو' کو فکشن کے علاوہ منٹو کا سوانحی اکاؤنٹ بھی سمجھیں تو منٹو جب بٹوت پہنچا ہے اس کی عمر ۳۷ سال تھی، یعنی منٹو کی وفات سے قریب چھ سال پہلے کا قصّہ ہے یہ، منٹو کی وفات ۱۸ رجنوری ۱۹۵۵ء کو صرف بیالیس سال کی عمر میں ہوئی ہے۔ ان تاریخوں میں تضاد بھی ہو سکتا ہے، کیوں کہ لاہور میں مقیم منٹو کی چھوٹی بیٹی نصرت جلال منٹو نے میرے مسلسل اسرار پر فروری ۲۰۱۶ء میں جب، منٹو کا بٹوت سے اپنی ماں کو امرتسر کے پتہ پر لکھا تاریخی خط تلاش کر مجھے دستیاب کیا ہے، تو اپنے ای میل

میں اس خط کی تاریخ مئی ۱۹۳۶ء لکھی ہے۔ جب کہ بٹوت کے ایک کردار بیگو پر مبنی منٹو کی کہانی بیگو کو اگر حقیقت مان لیں تو منٹو اس خط کے تیرہ سال بعد ۱۹۴۹ء میں پہلی اور شاید آخری بار بٹوت وارد ہوئے ہیں۔ (جب کہ سعد اللہ شاہ کے مطابق منٹو ایک سے زیادہ مرتبہ علاج کی غرض سے بٹوت آئے ہیں۔)

غالب گمان یہی ہے کہ منٹو کی بیٹی نصرت جلال نے محض اندازے پر مجھے یہ تاریخ لکھوائی ہے۔ خط پر بظاہر منٹو نے بھی کوئی تاریخ نہیں لکھی ہے سو یہ ثابت کر پانا مشکل ہے کہ منٹو کن تاریخوں میں بٹوت میں بغرض علاج رکے ہیں۔ نصرت جلال کے ہی مطابق منٹو کم وبیش تین ماہ دق کے علاج کی غرض سے بٹوت رکے تھے۔ خیر یہ بات ہنوز تحقیق کی متقاضی ہے، ویسے اگر اس کہانی کی حقیقت کو بنیاد بنا کر دیکھیں تو منٹو کی آخری سانسوں کے دنوں میں یہ کہانی لکھی جا رہی ہے۔ اس حساب سے ۱۹۴۹ء کا سال صحیح ثابت ہو رہا ہے۔ منٹو کہانی میں ایک جگہ کہہ بھی رہے ہیں:

> ''سات برس پہلے کے تمام واقعات اس وقت میری نظروں کے سامنے ہیں۔ دیکھئے، میں لاہور سے گرمیاں گزارنے کے لیے کشمیر کی تیاریاں کر رہا ہوں۔''

کہانی میں مزید آگے بڑھ کر وہ ایک بار پھر اس بات کا اشارہ دیتے ہیں کہ بیگو کی کہانی لکھتے/سوچتے وقت منٹو اپنی آخری سانسیں لے رہے تھے:

> ''ڈاکٹر صاحب آپ میری بکواس سُنتے سُنتے تنگ تو نہیں آ گئے۔ خدا معلوم کیا کیا کچھ بکتا رہوں۔ تکلف سے کام نہ لیجیے، آپ واقعی کچھ نہیں سمجھ سکتے، میں خود نہیں سمجھ سکتا۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ بٹوت سے واپس آ کر میرے دل ودماغ کا ہر جوڑ ہل گیا تھا۔ اب یعنی آج جب کہ میرے جنون کا دورہ ختم ہو چکا ہے اور موت کو چند قدم کے فاصلے پر دیکھ رہا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ وزن جو میری چھاتی کو دابے ہوئے تھا ہلکا ہو گیا ہے اور میں پھر زندہ ہو رہا ہوں۔ موت میں زندگی۔ کیسی دلچسپ چیز ہے! آج میرے ذہن سے دھند کے تمام بادل اُٹھ گئے ہیں۔ میں ہر چیز کو روشنی میں دیکھ رہا ہوں۔ سات برس پہلے کے تمام واقعات اس وقت میری نظروں کے سامنے ہیں۔''

منٹو بٹوت میں پہنچنے اور پہنچتے ہی ایک دیہاتی لڑکی بیگو کے ساتھ ہوئے اپنے این کاؤنٹر کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں :

> ''میں لاہور سے گرمیاں گزارنے کے لیے کشمیر کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ سوٹ سلوائے جا رہے ہیں۔ بوٹ ڈبوں میں بند کئے جا رہے ہیں۔ ہولڈرال اور ٹرنک کپڑوں سے پُر کئے جا رہے ہیں۔ میں رات کی گاڑی سے جموں روانہ ہوتا ہوں۔ شمیم میرے ساتھ ہے۔ گاڑی کے ڈبے میں بیٹھ کر ہم عرصہ تک باتیں کرتے رہتے ہیں۔ گاڑی چلتی ہے۔ شمیم چلا جاتا ہے۔ میں سو جاتا ہوں۔ دماغ ہر قسم کی فکر سے آزاد ہے۔ صبح جموں کی اسٹیشن پر جاگتا ہوں۔ کشمیر کی حسین وادی کی ہونے والی سیر کے خیالات میں مگن لاری پر سوار ہوتا ہوں۔ بٹوت سے ایک میل کے فاصلے پر لاری کا پہیہ پنکچر ہو جاتا ہے۔ شام کا وقت ہے اس لیے رات بٹوت کے ہوٹل میں کاٹنی پڑتی ہے۔ اس ہوٹل کا کمرہ بے حد غلیظ معلوم ہوتا ہے مگر کیا معلوم تھا

کہ مجھے وہاں پورے دو مہینے رہنا پڑے گا۔صبح سویرے اُٹھتا ہُوں تو معلوم ہوتا ہے کہ لاری کے انجن کا ایک پرزہ بھی خراب ہو گیا ہے۔اس لیے مجبوراً ایک دن اور بٹوت میں ٹھہرنا پڑے گا۔یہ سُن کر میری طبیعت کس قدر افسردہ ہو گئی تھی!اس افسردگی کو دور کرنے کے لیے میں۔۔۔میں اس روز شام کو سیر کے لیے نکلتا ہوں۔چیڑ کے درختوں کا تنفس،جنگلی پرندوں کی نغمہ سرائیاں سیب کے لدے ہُوئے درختوں کا حسن اور غروب ہوتے ہوئے سورج کا دلکش سماں،لاری والے کی بے احتیاطی اور رنگ میں بھنگ ڈالنے والی تقدیر کی گستاخی کا رنج افزا خیال محو کر دیتا ہے۔میں نیچر کے مسرت افزا مناظر سے لطف اندوز ہوتا سڑک کے ایک موڑ پر پہنچتا ہوں۔۔۔دفعتاً میری نگاہیں اُس سے دوچار ہوتی ہیں۔بیگو مجھ سے بیس قدم کے فاصلے پر اپنی بھینس کے ساتھ کھڑی ہے۔۔۔جس داستان کا انجام اس وقت آپ کے پیش نظر ہے۔اس کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔وہ جوان تھی۔اس کی جوانی پر بٹوت کی فضا پوری شدت کے ساتھ جلوہ گر تھی۔سبز لباس میں ملبوس وہ سڑک کے درمیان مکئی کا ایک دراز قد بوٹا معلوم ہو رہی تھی۔ چہرے کے تانبے ایسے تاباں رنگ پر اس کی آنکھوں کی چمک نے ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی۔جو چشمے کے پانی کی طرف صاف اور شفاف تھیں۔۔۔میں اس کو کتنا عرصہ دیکھتا رہا۔یہ مجھے معلوم نہیں۔لیکن اتنا یاد ہے کہ میں نے دفعتاً اپنا سینہ موسیقی سے لبریز پایا۔اور پھر میں مسکرا دیا۔اس کی بہکی ہوئی نگاہوں کی توجہ بھینس سے ہٹ کر میرے تبسم سے ٹکرائی۔میں گھبرا گیا۔اس نے ایک تیز تجسس سے میری طرف دیکھا۔جیسے وہ کسی بھولے ہوئے خواب کو یاد کر رہی ہے۔پھر اس نے اپنی چھڑی کو دانتوں میں دبا کر کچھ سوچا اور مسکرا دی،اس کا سینہ چشمے کے پانی کی طرح دھڑک رہا تھا۔میرا دل بھی میرے پہلو میں انگڑائیاں لے رہا تھا۔۔۔اور یہ پہلی ملاقات کس قدر لذیذ تھی۔اس کا ذائقہ ابھی میرے جسم کی ہر رگ میں موجود ہے۔''

اس کہانی میں ایک جگہ ذکر کرتے ہوئے منٹو اپنے کردار کی عمر اٹھارہ سال بتاتا ہے۔منٹو لکھتا ہے:

''اس نے جاتے ہوئے پانچ چھ مرتبہ میری طرف مڑ کر دیکھا۔لیکن فوراً سر پھیر لیا۔جب وہ اپنے گھر میں داخل ہو گئی جو سڑک کے نیچے مکئی کے چھوٹے سے کھیت کے ساتھ بنا ہوا تھا۔میں اپنی طرف متوجہ ہوا۔میں اس کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔اس احساس نے مجھے سخت متحیر کیا۔میری عمر اس وقت اٹھارہ سال کی تھی۔کالج میں اپنے ہم جماعت طلبہ کی زبانی میں محبت کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔عشقیہ داستانیں بھی اکثر میرے زیر مطالعہ رہی تھیں۔مگر محبت کے حقیقی معانی میری نظروں سے پوشیدہ تھے۔اس کے جانے کے بعد جب میں نے ایک ناقابل بیان تلخی اپنے دل کی دھڑکنوں میں حل ہوتی ہوئی محسوس کی تو میں نے خیال کہ شاید اسی کا نام محبت ہے۔۔۔یہ محبت ہی تھی۔''

بیگو سے اس پہلی ملاقات کے فوراً بعد کہانی کے الھڑ کردار (سعید/سعادت حسن منٹو) پر جو بیتتی ہے اس کا اثر کہانی کے اس اقتباس میں دیکھئے:

''میں نے جب بیگو سے اپنے دل کو وابستہ ہوتے محسوس کیا تو فطری طور پر میرے دل میں اس رفیقۂ حیات کا خیال پیدا ہوا جس کے متعلق میں اپنے کمرے کی چار دیواری میں کئی خواب دیکھ چکا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میرے دل سے یہ صدا اٹھی۔ دیکھو سعید یہ لڑکی ہی تمہارے خوابوں کی پری ہے.. چنانچہ میں تمام واقعے پر غور کرتا ہوا ہوٹل واپس آیا اور ایک ماہ کے لیے بٹوت کے ہوٹل کا وہ کمرہ کرائے پر اٹھالیا جو مجھے بے حد غلیظ محسوس ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہوٹل کا مالک میرے اس ارادے کو سن کر بہت متحیر ہوا تھا۔ اس لیے کہ میں صبح اس کی غلاظت پسندی پر ایک طویل لیکچر دے چکا تھا۔ داستان کتنی طویل ہوتی جارہی ہے۔''

بیگو کے کردار کو ڈیولپ کرتے ہوئے منٹو ایک جگہ دلچسپ سین تخلیق کرتے ہیں یہ سین اس دیہاتی لڑکی کے بولڈ کردار کے بارے میں بہت کچھ کہنے کی کوشش کررہا ہے:

''آپ کی ڈبیا دیکھ کر میرے ذہن میں ایک اور واقعہ کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔ بیگو بھی سگریٹ پیا کرتی تھی میں نے کئی بار اسے گولڈ فلیک کی ڈبیاں لا کر دی تھیں۔ وہ بڑے شوق سے ان کو منہ میں دبا کر دھوئیں کے بادل اڑایا کرتی تھیں۔ ذھواں۔۔۔! میں اُس نیلے نیلے ذھوئیں کو اب بھی دیکھ رہا ہوں جو اس کے گیلے ہونٹوں پر رقص کیا کرتا تھا۔''

منٹو کہانی بیگو کے ابتدائی حصّے میں ڈاکٹر سے بات کرتے ہوئے کہتا ہے:

''میری عمر اِس وقت پچیس برس کی ہے۔ آج سے ٹھیک سات برس پہلے میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ آہ ان سات برسوں کی روداد کتنی حیرت افزا ہے اگر کوئی شخص اس کی تفصیل کاغذوں پر پھیلا دے تو انسانی دلوں کی داستانوں میں کیسا دلچسپ اضافہ ہو۔ دنیا ایک ایسے دل کی دھڑکن سے آشنا ہوگی۔ جس نے اپنی غلطی کی قیمت خون کی ان تھوکوں میں ادا کی ہے۔ جنہیں آپ ہر روز اس لئے جلاتے رہتے ہیں کہ ان کے جراثیم دوسروں تک نہ پہنچیں۔''

منٹو کے افسانہ ''بیگو'' کو بار بار پڑھنے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ یہ ایک فکشن کا نایاب کارنامہ ہے لیکن کافی حد تک ہمارے علاقے کے حوالے سے ایک تاریخی ڈاکومینٹ بھی ہے۔ منٹو مریض تھے سو اس حالت میں کیا لکھتے۔ بٹوت کے بارے میں انہوں نے جو بھی لکھا ہوگا امرتسر یا لاہور واپسی پر ہی لکھا ہوگا۔ سو تاریخوں کے حوالے سے باتیں مستند نہ ہوں گی۔ البتہ ''بیگو'' جیسے افسانے اس طرف ہماری راہنمائی ضرور کرتے ہیں۔ انشااللہ اس موضوع پر آئندہ بھی تحقیق جاری رکھنے کا اعادہ ہے۔

یہ تو تھی تفصیل ''بیگو'' کے حوالے سے منٹو کے اُس عہد کی جب وہ بٹوت آتے جاتے رہے ہیں۔ اسی دوران فروری ۲۰۱۶ء میں، میں نے منٹو اور بٹوت کے رشتے کی تاریخی حیثیت کو ڈاکومنٹ کرنے کے لئے پاکستان میں مقیم منٹو کی تینوں بیٹیوں کے ساتھ رابطہ قائم کیا۔ میں کشمیر اور کشمیر سے متعلق نامور اردو ادیبوں کے خانوادوں سے اپنے رسالے ''بے لاگ۔ سرینگر'' کے لیے انٹرویوز کی ایک سیریز کررہا تھا

جس کے تحت فیضؔ اور کرشن چندر کے اقرباء سے بھی رابطہ کیا گیا تھا۔ سو میں نے کچھ دستاویزات اکٹھی کی تھیں۔

آپ اُردو جرنل کے قارئین خوش بخت ہیں کہ آپ اُن میں ایک نادر و نایاب تاریخی دستاویز کو پڑھ رہے ہیں، اسے دیکھ پا رہے ہیں۔ یہ سعادت حسن منٹو کے ہاتھ کا لکھا وہ مشہور خط ہے جو اُنھوں نے اپنی کشمیری سرزمین کے گاؤں بٹوت (اس وقت ضلع ڈوڈہ) سے اپنی ماں سردار بیگم عرف چھوٹی بیگم کو تب لکھا جب وہ اپنے علاج کے سلسلے میں بٹوت (صوبہ جموں) آئے ہوئے تھے۔ یہ خط حوالے کرتے ہوئے لاہور میں مقیم منٹو کی سب سے چھوٹی بیٹی نصرت جلال منٹو نے فرطِ جذبات میں مجھے کہا تھا، ''لیاقت میاں خوش بخت ہو کہ ایک صدی سے ہمارے پاس محفوظ کشمیر کی یہ امانت میں آج تمھارے ہاتھوں، اپنے کشمیر کو واپس روانہ کر رہی ہوں، منٹو واپس کبھی اپنے وطن تو نہ پہنچ سکے، چلو اُن کا خط ہی سہی۔''

بقول نصرت منٹو، یہ خیریت کا خط آج سے قریباً ۸۰ سال پہلے مئی ۱۹۳۶ء میں منٹو نے امرتسر میں مقیم اپنی والدہ کو بھیجا تھا۔ منٹو اپنی بیماری کے چلتے ڈاکٹروں کی ایما پر ایک ٹھنڈے پہاڑی علاقے میں رہنے کی غرض سے بٹوت، صوبہ جموں آ پہنچے تھے، جہاں انھوں نے تین مہینے قیام کیا، اور صحت سنبھلنے کے بعد واپس امرتسر لوٹ گئے۔ منٹو کی کچھ ایک کہانیوں کا ذکر بھی ملتا ہے جو انھوں نے بٹوت میں ہی لکھیں، یہاں اُن کے ایک دیہاتی خاتون بیگو کے ساتھ وقتی معاشقے کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔

آپ بخوبی واقف ہیں کہ منٹو نسلاً کشمیری تھے، بقول ماہر منٹویات ڈاکٹر برج پریمی کشمیری، منٹو اُس کشمیری خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جو انیسویں صدی میں بہتر روزگار کے سلسلے میں کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب جا بسا تھا، منٹو کے اجداد شال بافی اور پشمینے کے کاروبار سے جڑے ہوئے تھے۔ اُن کے جدِ امجد خواجہ رحمت اللہ پہلے لاہور مقیم ہوئے، پھر بہتر روزگار کی تلاش میں ہمیشہ کے لئے امرتسر آ گئے۔ یہ خاندان آئندہ تقسیم تک امرتسر میں ہی رہا۔ یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا زمانہ تھا۔ آگے چل کر خواجہ رحمت اللہ کے پوتے اور منٹو کے دادا جان خواجہ جمال الدین نے یہ بزنس لاہور اور بمبئی تک بڑھایا۔ انگریز حکومت کا دائرہ اختیار سمٹتے ہی شال بافی کا یہ کاروبار بھی گھاٹے کا سودا ہو گیا۔ منٹو خاندان کی اگلی نسل نے وکالت کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیا۔ خواجہ جمال الدین کے سبھی بیٹے وکالت کے پیشے سے جڑ گئے۔ بڑے فرزند خواجہ عبدالغنی اپیل رائٹر ہو گئے۔ خواجہ اسعد اللہ وکیل اور خواجہ میاں حبیب اللہ اٹارنی۔ سب سے چھوٹے بھائی اور منٹو کے والد مولوی غلام حسن منصف/سب جج ہو گئے— اِن تمام کشمیریوں نے الگ سے امرتسر میں محلہ وکیلاں کے نام سے ایک محلہ آباد کیا تھا۔

منٹو کی والدہ سردار بیگم کا تعلق کابل کی ایک افغان فیملی سے تھا۔ یہ مولوی غلام حسن کی دوسری بیگم تھیں، جن میں سے منٹو کے علاوہ دو بیٹیاں بھی تھیں۔ منٹو کی والدہ انتہائی شریف النفس اور کم گو ثابت ہوئیں۔ وہ بھی شال بافی اور امبر ایڈری جانتی تھیں۔ منٹو کے والد صاحب نے دوسری منکوحہ ہونے کے سبب ان کو ہمیشہ نظر انداز ہی کیا۔ انھوں نے بڑی تنگدستی میں یہ بچے پالے۔ منٹو کی والدہ تمام عمر منٹو کے ساتھ ہی رہیں۔ امرتسر کے بعد دہلی اور بمبئی میں بھی۔ منٹو کی والدہ کی وفات جون ۱۹۴۰ء میں ہوئی۔

منٹو کی والدہ کی شدید خواہش پر ہی منٹو کی شادی فجی افریقہ میں جا بسے ایک کشمیری خاندان کی لڑکی بیگم صفیہ سے ہوئی۔ صفیہ

سے منٹو کو چار اولادیں ہوئیں، تین بیٹیاں نکہت، نزہت اور نصرت اور ایک بیٹا عارف۔ جو ایک سال کی عمر کو پہنچتے ہی چل بسا۔ منٹو اور صفیہ کا ساتھ صرف سولہ برس رہا۔ یہی زمانہ منٹو کا عروج کا زمانہ تھا۔ منٹو صرف تیالیس سال تک جئے، ان کی وفات ۱۸/ جنوری ۱۹۵۵ء کو ہوئی۔ صفیہ نے منٹو کی جوان مرگی کے بعد بڑی چھوٹی عمر میں ہزار صعوبتیں جھیل کر تینوں بیٹیوں کو بے پناہ محبت سے پالا۔ منٹو کی وفات کے بائیس سال بعد صفیہ منٹو کی وفات نومبر ۱۹۷۷ء کو ہوئی۔

منٹو اپنی اس دلیر اور حوصلہ مند بیگم کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں، ''مگر یہ بھی تو سوچو کہ صفیہ نہ ہوتی تو منٹو کیسے ہوتا؟ کوئی اور صفیہ تو دکھاؤ جو مجھ جیسے آگ کے گولے کو اپنی ہتھیلیوں میں چھپالے، کیا صابر عورت تھی؟ کہاں طعنوں اور نشے سے چور پچیس روپے کا ایک کہانی فروش اور کہاں صفیہ؟

(صفیہ کہتی تھیں) یہ دس روپے آپ کی بوتل کے، یہ پانچ روپے آپ کے آنے جانے کے اور یہ دس۔۔۔ اِس میں گھر کا خرچہ چل جائیگا۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں ہوں نا۔''

آخر میں منٹو کے اس خط کی تحریر جو منٹو نے بٹوت سے اپنی والدہ کو امرتسر کے پتّے پر لکھا تھا:

بٹوت

مکرم والدہ صاحبہ

اسلام علیکم.. کل شام کو سیر کو نکل رہا تھا کہ آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا۔ یہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ اقبال خیر و عافیت سے بمبئی پہنچ گئی ہے۔ جاوید کی علالت کی خبر سخت وحشت ناک ہے۔ خدا اُس ننّھے سے جی کو اپنی امان میں رکھے۔ اگر اُس کو مجھ سے محبت ہے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں اُس سے کم پیار رکھتا ہوں؟ وہ مجھے خاص طور پر اس لئے عزیز ہے کہ وہ میری اپنی بہن کا نورِ نظر ہے۔ میرے دل میں اُس سے متعلق سینکڑوں امیدیں ہیں، خدا کرے وہ بروئے کار آئیں۔ بہر حال مجھے یقین ہے کہ وہ بہت ہوشیار لڑکا ثابت ہوگا۔

جاوید کی علالت کا سب سے بڑا سبب جو مجھے امرتسر میں ڈاکٹر نے بتایا وہ یہ تھا کہ وہ دانت نکال رہا ہے۔ اِس قسم کی بیماری میں قے اور دست بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ اطلاع بہت جان بخش ہے کہ اب وہ روبہ صحت ہے اور خدا کے فضل سے بہت خوش ہے، اُس شریر کا وہ مسکین اور نہایت ہی مظلوم شکل بنانا مجھے یہاں بھی نہیں بھول رہا۔ کیا بمبئی میں بھی وہ اب اِس قسم کی ترحم انگیز شکل بناتا ہے، اُس کا منٹ منٹ کے بعد ہاتھ نکالنا، میرے خیال میں ایسی پیاری حرکتیں بہت کم بچّے کرتے ہیں۔

میری صحت میں کوئی خاص فرق نہیں۔ سینے میں درد رہتا ہے، بہر حال اتنا ضرور ہے کہ میری کمر کا درد اب بہت حد تک جاتا رہا ہے اور سیر کرنے کے بعد تکان محسوس نہیں ہوتی۔ میں چار پانچ میل روزانہ صبح اور شام سیر کرتا ہوں اور دن کا بیشتر حصّہ پیڑوں کے سائے میں گزارتا ہوں۔ آپ کوئی فکر نہ کریں۔ انشااللہ صحت بہت جلد ہو جائے گی۔

اس ہفتے میں یہاں نئے قسم کے دو ٹیکے کرائے ہیں، باقی پانچ اور ہیں۔ جموں سے دوا کی دو شیشیاں بھی لے گیا تھا جس کا استعمال جاری ہے۔ اِس ہفتے دو بار سالم چُوزے بھی کھائے ہیں جو ہضم ہو گئے۔ یہاں کا پانی ہاضم ہے۔ یہ جگہ بہت اچّھی ہے مگر رہائش اور کھانے کا دام بہت زیادہ ہیں۔ اس لئے کہ یہاں ہر شے باہر سے آتی ہے۔ کشمیر گورنمنٹ نے محصول اسقدر بڑھا رکھا ہے کہ لازماً ہر چیز کے دام ڈگنے یا ڈیوڑھے ہو جاتے ہیں۔

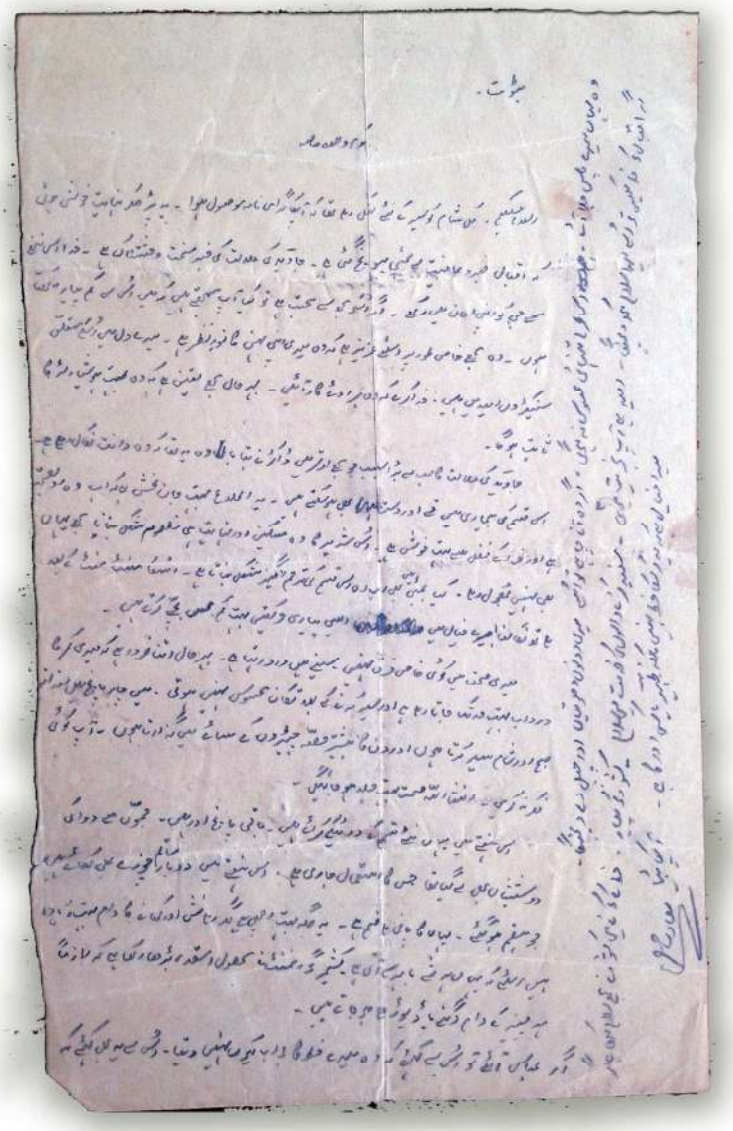

اگر عبّاس آئے تو اُس سے کہیے کہ وہ میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیتا۔ اُس سے یہ بھی کہیے کہ وہ یہاں میرے پاس چلا آئے۔ اِس طرح تنہائی محسوس نہ ہوگی۔ اگر وہ آنا چاہے تو اُسے میری دونوں دھوتیاں اور چپل دے دیجئے گا۔ گر اقبال کو خط لکھیں تو اُسے میرا سلام لکھ دیجئے گا۔ امید ہے آپ بخیریت ہوں گی، سفید کڑے والوں کی خدمت میں سلام۔ کشور کو پیار، خط کے کونے میں کشور نے مجھے سلام لکھا ہے گر میرا خیال ہے کہ یہ اُس کا خط نہیں بلکہ ظہیر یا کسی اور کا ہے۔

آپ کا بیٹا

سعادت حسن